شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی فکر کا تجزیاتی مطالعہ

محمد انس حسان☆

Abstract:

"The Ulma of the subcontinent have always shown a considerable interest towards the diverse Islamic philosophy and exerted great efforts for its conservation and development since centuries. There is no doubt that this fertile land has produced great scholars. Among these great scholars Shah Wali Ullah Muhaddis Dehelwi (1703-1762) is one of the prominent name,who has written many of books on different fields of Islam.Shah Wali Ullah is hailed as one of the greatest writer,researcher and thinker in the discipline of Islamic philosophy. This paper attempts to enlighten many aspects of his philosophical ideology and explores his scholarly contribution towards subcontinent's politics, economics, education and spiritual fields."

Key Words: Sub Continent, Shah Wali Ullah, Islamic Philosophy, Scholarly Contribution.

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۴ شوال ۱۱۱۴ھ بمطابق ۲۱ فروری ۱۷۰۳ء چہار شنبہ کے دن طلوع آفتاب کے وقت شیخ محمد پھلتی کی صاحبزادی فخر النساء کے بطن سے پیدا ہوئے۔[۱] آپ کا نام قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے نام پر ''قطب الدین'' رکھا گیا جبکہ تاریخی نام ''عظیم الدین'' ہے۔[۲] تاہم ''ولی اللہ'' کے نام سے آپ کو شہرت ملی۔ آپ کے والد شاہ عبدالرحیم دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۶۴۴ء۔۱۷۱۸ء) بہت بڑے عالم دین اور صوفی تھے۔ انہوں نے ''فتاویٰ عالمگیری'' کی تدوین میں حصہ لیا تھا۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سلسلۂ نسب والد کی طرف سے تیس واسطوں سے حضرت فاروق اعظمؓ تک اور والدہ کی طرف سے امام موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔ ہندوستان کے اس وقت کے رواج کے مطابق شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پندرہویں سال میں تعلیم سے فراغت حاصل کر لی۔ اسی دوران آپ کی شادی آپ کے ماموں کی بیٹی اور شیخ محمد عاشق پھلتی (۱۶۹۹ء۔۱۷۴۷ء) کی بہن ''امۃ الرحیم'' سے ہوئی، تاہم مختصر عرصہ ہی میں اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بطن سے ایک صاحبزادے شیخ محمد[۳] جبکہ ایک صاحبزادی امۃ العزیز[۴] تھیں۔

☆ لیکچرر شعبہ اسلامیات گورنمنٹ کالج جہانیاں

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرا عقد ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں سونی پت میں ''بی بی ارادت'' سے کیا اور ان کے بطن سے نو اولادیں ہوئیں جن میں سے درج ذیل چار فرزندان گرامی کو خصوصی شہرت نصیب ہوئی۔ شاہ عبدالعزیز (۱۷۴۵ء ۔ ۱۸۲۲ء)، شاہ رفیع الدین (۱۷۴۹ء ۔ ۱۸۱۸ء)، شاہ عبدالقادر (۱۷۵۲ء۔۱۸۱۵ء) اور شاہ عبدالغنی (۱۷۵۵ء۔۱۷۸۸ء)۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تحصیلِ علم کے بعد کم وبیش بارہ سال تک اپنے والد کے قائم کردہ ''مدرسہ رحیمیہ'' میں درس دیا، جن میں سے تین سال ایسے ہیں جن میں وہ اپنے والد کی زندگی میں درس دیتے رہے۔ ۱۱۴۳ھ/۱۷۳۰ء کے آخر میں حج سے مشرف ہوئے اور زیارت کے ساتھ ساتھ شیوخِ حدیث (بالخصوص شیخ محمد طاہر مدنی رحمۃ اللہ علیہ) سے خوب کسبِ فیض کیا۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمر اس وقت تیس سال تھی۔(۵) ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۱ء میں آپ نے دوبارہ مناسک حج ادا کیے اور ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء کے اوائل میں واپس ہندوستان تشریف لے آئے۔(۶) اسی سفر میں آپ کو ایک روحانی مکاشفہ کے ذریعہ بتایا گیا کہ وہ ''قائم الزماں'' ہیں(۷) اور برعظیم کے معروضی حالات میں انہیں اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ چنانچہ اس سفر سے واپس آ کر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے برعظیم کے حالات کا عمیق مشاہدہ کرنے کے بعد مختلف شعبوں میں زوال کے اسباب اور ان کے حل کے لیے ایک واضح اور مکمل نظامِ فکر کو اپنی متعدد کتب میں مرتب کیا۔ ان کے بعد اس فکر کو ان کے فرزند شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے عام فہم انداز میں عوامی سطح پر متعارف کروایا۔

بناء بریں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدرسہ رحیمیہ کی تدریسی ذمہ داریاں اپنے فرزندِ ارجمند شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کو منتقل کر کے خود تصنیفی مصروفیات میں مشغول ہو گئے۔ جن کی ترتیب وتسوید کا کام ان کے ماموں زاد اور دوست شیخ محمد عاشق پھلتی رحمۃ اللہ علیہ نے سرانجام دیا۔ مولانا نسیم احمد فریدی کے مطابق شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتب کی تعداد ۶۱ کے قریب ہے۔ انہوں نے شاہ صاحب سے غلط طور پر منسوب ۸ کتب کا ذکر بھی کیا ہے۔(۸) لیکن ڈاکٹر محمد مظہر بقا رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق آپ رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف کردہ کتب کی تعداد ۷۳ ہے۔(۹) البتہ ۸ غلط طور پر منسوب کتب کا وہ بھی اعتراف کرتے ہیں۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سب سے پہلے اردو سوانح نگار رحیم بخش کے مطابق شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتب کی تعداد تو سو سے بھی متجاوز ہیں تاہم انہوں نے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ۴۵ کتب کا ذکر کیا ہے۔(۱۰) محض ۶۱ سالہ زندگی میں سے ۲۸ سالہ تصنیفی زندگی میں ۶۱ علمی کتب ورسائل کی تصنیف ایک محیر العقول کام ہے جس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ کے مرض الموت کا آغاز بڈھانہ (ضلع مظفر نگر) سے ہوا۔ یکم جولائی ۱۷۶۲ء کو آپ علاج کے لیے دہلی تشریف لائے اور اپنے مرید وشاگرد بابا فضل اللہ کشمیری کے مکان پر قیام کیا۔ ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ بمطابق ۲۰ اگست ۱۷۶۲ء جمعہ کے دن ظہر کے وقت آپ کا انتقال ہوا۔ منہدیاں کے قبرستان میں اپنے والد ماجد کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ ''او بود امام اعظم دین'' سے آپ کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۷۰۳ء۔۱۷۶۲ء) نے جس دور میں آنکھ کھولی۔ اس دور میں

مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ چنانچہ ان کی پیدائش کے چار سال بعد ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کم وبیش ۵۰ سالہ حکمرانی کے بعد اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اس واقعہ کے بعد برعظیم میں مسلمانوں کی عظمت زوال پذیر ہونا شروع ہوئی اور بتدریج سیاست، معیشت، معاشرت اور تعلیمی فضا خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ اس حوالے سے مفتی عبدالخالق آزاد لکھتے ہیں کہ:

''شاہ صاحب نے جب شعور کی آنکھ کھولی اور اس دور کے حالت پر نظر ڈالی تو انہیں پتہ چلا کہ تقریباً سات سو سالہ نظام سلطنت، جس نے ہندوستانی سماج کو بڑی حسن وخوبی سے منظّم کر کے مضبوط بنیادوں پر استوار کیا تھا اورنگ زیب عالمگیر جیسے مدبر اور منتظم بادشاہ کی وفات کے بعد انتشار کا شکار ہے۔ سماج کے کل پرزے اپنے اپنے مقامات سے ہٹ رہے ہیں۔''(۱۱)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مسلمانوں کے دورِ عروج اور دورِ زوال کے چشم دید گواہ ہیں۔ انہیں ایک طرف تو دورِ عروج کا فکری شعور ورثہ میں ملا تو دوسری طرف وہ آنے والے دور کے سماجی انتشار اور فکری زوال کا بھی مکمل ادراک رکھتے تھے۔ اس کے برعکس برعظیم کے دیگر مفکرین اور مجتہدین یا تو دورِ عروج میں یا پھر دورِ زوال میں پیدا ہوئے۔ ولی اللّٰہی فکر کی اہمیت کے اس گوشے پر روشنی ڈالتے ہوئے قاضی جاوید نے بالکل بجا لکھا ہے کہ:

''شاہ ولی اللہ مغل سلطنت کے عہد زوال اور برصغیر کے معاشی، تہذیبی، نفسیاتی اور سیاسی غلبہ کے درمیانی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی حیثیت برصغیر میں مسلمانوں کے قدیم اور جدید ادوار کے درمیان ایک پل جیسی ہے۔''(۱۲)

الف۔ سیاسی افکار ونظریات

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا دور سیاست کے حوالے سے برعظیم میں مسلمانوں کے انحطاط کا دور تھا۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد گیارہ مغل بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ اس دور میں گیارہ بادشاہوں کا بدلنا برعظیم کے سیاسی عدم استحکام کا پتہ دیتا ہے۔ اس تیزی کے ساتھ اور اس نہج پر بادشاہوں کی تبدیلی سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں کہ یہ سلطنتِ مغلیہ کی جانکنی کا عالم تھا۔(۱۳) مرکز کی کمزوری، ریاستی طوائف الملوکی اور بیرونی سازشوں کو دعوت دیتی ہے۔ چنانچہ مرکز دہلی کی کمزوری کی وجہ سے کئی علاقوں نے خودمختاری کا اعلان کر دیا، جو حسبِ ترتیب یوں تھیں۔

- ☆ بنگال اور بہار پر علی وردی خان نے قبضہ کر لیا۔
- ☆ اودھ پر برہان الملک اور صفدر جنگ قابض ہو گئے۔
- ☆ دکن میں نظام الملک نے حکومت قائم کر لی۔

ان خودمختار صوبوں نے برعظیم کی مجموعی آمدنی کو بھی تقسیم کر دیا۔ جس سے مرکز کی حیثیت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی۔ ان خودمختار صوبوں کے علاوہ کئی مفاد پرست تحریکات بھی اس دور کے سیاسی

حالات پر اثر انداز ہو رہی تھیں، جو درج ذیل ہیں۔

روہیلہ: روہیلے کابل وقندھار پر نادر شاہ کے تسلط کے بعد ہندوستان میں پناہ گزین ہوئے تھے۔ انہوں نے دوآبہ میں اپنی سلطنت روہیل کھنڈ قائم کر رکھی تھی۔ بہادر، جنگ جو، سادہ طبیعت اور کردار کے پکے مسلمان تھے۔

مرہٹہ: جنوبی ہند کی مرہٹہ تحریک، سیواجی کی سرکردگی میں ابتدا ہی سے فتنہ پرور تحریک تھی(۱۴) اورنگ زیب عالمگیر نے اس تحریک کو ۲۵ سال کوشش کر کے ختم کیا تھا۔ مگر اس تحریک نے دوبارہ سر اٹھایا اور برعظیم کی سیاسی صورت حال انتہائی خستہ حال کر دی۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے احمد شاہ ابدالی کو جب دعوت دی تو اس کا مقصد بھی اس قوم کا استیصال تھا۔

سکھ: شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں سکھوں کو ایک دہشت انگیز اور زلزلہ خیز طاقت حاصل ہو گئی تھی جنہوں نے شہری امن اور خاص طور پر مسلمانوں کے ذہنی سکون کو برباد کر کے رکھ دیا تھا۔(۱۵)

انگریز: شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں انگریز سامراج بھی دھیرے دھیرے برعظیم کی تباہی میں اپنا کردار ادا کر رہا تھا۔ قاضی جاوید نے یہ رائے قائم کی ہے کہ:

> ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو انگریزوں کی بڑھتی ہوئی قوت اور ان کے منصوبوں کا شعور نہیں تھا۔ ..... احمد شاہ ابدالی کے نام مکتوب میں شاہ نے اپنے عہد کے سیاسی حالات اور مختلف سیاسی قوتوں کا ذکر اور تجزیہ کیا تھا مگر تعجب انگیز طور پر اس مکتوب میں انگریزوں کا کوئی ذکر موجود نہیں۔''(۱۶)

شاید قاضی جاوید صاحب نے یہ خط بغور مطالعہ نہیں کیا۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نظام الملک کی اولاد کا ذکر کرتے ہوئے اسی خط میں انگریزوں کا بھی ذکر کیا ہے(۱۷) یہ بات درست ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جس اہتمام سے مرہٹہ، جاٹ اور سکھوں کا ذکر کیا ہے اس اہتمام سے انگریز سامراج کا ذکر نہیں کیا مگر اس سے یہ سمجھنا کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی بڑھتی ہوئی قوت کا شعور نہیں تھا قطعی درست نہیں۔ اس سے ممکنہ طور پر یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تمام تر کاوش انہی مقامی قوتوں کے خلاف تھی۔ چنانچہ کئی محققین نے تو سیدین کی تحریک کو بھی سکھوں کے خلاف کہہ کر اس تحریک کی روح کو متاثر کرنے کی کوشش کی ہے۔(۱۸)

احمد شاہ ابدالی کو لکھے گئے خط سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ شاید شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس خطے میں انتشار پھیلانے والے بعض عناصر کا قلع قمع کر کے مغلیہ سلطنت کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے چاہتے تھے(۱۹) جبکہ حقیقت یہ ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مغلیہ سلطنت سے بالکل مایوس اور ناامید تھے۔ چنانچہ برعظیم کے سیاسی تناظر میں وہ جو نظام فکر تشکیل دے رہے تھے اس کی تدوین میں انہیں کچھ وقت درکار تھا۔ اس حوالے سے پروفیسر محمد سرور (۱۹۸۳ء۔۱۹۰۶ء) نے بالکل بجا لکھا ہے کہ:

''شاہ ولی اللہ کی تحریک مغلوں کی گرتی ہوئی شاہی عمارت کو تھامنے نہیں اٹھی تھی۔ وہ تو بادشاہی نظام کو فرسودہ اور بے کار ہوتا دیکھ رہے تھے۔ اس کے پنپنے اور باقی رہنے سے مطلق ناامید تھے۔ دراصل ان کی تحریک کا دارومدار عام مسلمانوں پر تھا۔ وہ ان کے زوال آمادہ اونچے طبقوں کی بجائے عوام کو ہندوستان کی بادشاہت حاصل کرنے کی دعوت دینا چاہتے تھے۔''(۲۰)

سید قاسم محمود نے بھی اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''شاہ صاحب کو ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے سنبھل جانے کی کوئی امید نہ تھی، البتہ وہ مسلمانوں کے سیاسی زوال کو اس وقت تک کے لیے روک دینا چاہتے تھے، جب تک اندرونی عمرانی حالات کے تحت کوئی متبادل انتظام نہ ہو جائے۔ ان کے نزدیک سیاسی تحریک کی کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ سب سے پہلے گردوپیش کے حالات درست ہو جائیں۔''(۲۱)

اس کی تائید شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اصول ''**فك كل نظام**'' (ہر بوسیدہ نظام کو توڑ ڈالو) سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ سمجھتے تھے کہ موجودہ نظام میں وہ تمام خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں جو قیصر و کسریٰ کے نظام میں تھیں۔ اس لیے اس کا متبادل نظام لانا از حد ضروری ہو گیا ہے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی فکر کے اہم نکات درج ذیل ہیں۔

حکمرانوں کو احساسِ ذمہ داری کی تلقین

طوائف الملوکی (جاٹ، سکھ، مرہٹہ اور دیگر خود مختار ریاستوں) نے مرکز کو کمزور کر دیا ہے اور اہم ملکی معاملات میں اس کی عمل داری ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ اسی وجہ سے بیرونی قوتیں (نادر شاہ، انگریز فرانسیسی وغیرہ) اس خطے کی سیاست پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں حکمرانوں کو اپنے فرائض پہچاننے کی دعوت دی(۲۲) وہیں ان قوتوں کے استیصال کے لیے احمد شاہ ابدالی اور نجیب الدولہ کے مضبوط اتحاد سے کام لیا اور وقتی طور پر ان قوتوں کو دبا کر حکمرانوں کو ایک اور موقع فراہم کیا۔ چنانچہ ان کے خطوط میں حکمرانوں کو جہاد کی اصل روح کی طرف لوٹنے کی دعوت جگہ جگہ نظر آتی ہے۔

خلافت ظاہرہ و باطنہ کا نظریہ

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور کا سیاسی تجزیہ کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آج دین غالب سے مغلوب ہوتا جا رہا ہے حالانکہ غلبہ دین مقاصدِ بعثت میں سے ہے اور جس دور میں بھی دین مغلوب ہوگا اس دور کے اہلِ دانش کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ دین کے غلبہ کے لیے اپنی جدوجہد کو منظّم کریں۔(۲۳) غلبہ دین کے لیے وہ خلافتِ ظاہرہ اور خلافتِ باطنہ(۲۴) کا تصور دیتے ہیں۔ وہ خلافت باطنہ کے احیاء کا عمل اپنی زندگی ہی میں شروع کر چکے تھے(۲۵) اور اس کی بنیاد پر خلافتِ ظاہرہ کے قیام کا ارادہ رکھتے تھے۔ آپ کے اس ارادے کو بعد ازاں آپ کے فرزند مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی تربیت یافتہ جماعت

نے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔

قومی انقلاب کی سوچ

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ قومی انقلاب کے بعد بین الاقوامی انقلاب کا نظریہ دیتے ہیں۔ان کے نزدیک جب تک قومی انقلاب نہیں آئے گا جس کا بیان وہ ارتفاق ثالث (۲۶) میں کرتے ہیں اس وقت تک بین الاقوامی انقلاب جس کا ذکر وہ ارتفاق رابع میں کرتے ہیں کا عمل ممکن نہیں۔غلبہ دین کے لیے وہ تلوار سے زیادہ دلوں کی مکمل تسخیر کا نظریہ رکھتے ہیں۔اگرچہ اس حوالے سے وہ اسلام کے فلسفہ جہاد کو بڑے موثر انداز میں پیش کرتے ہیں تاہم وہ جہاد کے لیے مناسب تیاری اور جماعت سازی کے قائل ہیں۔ان کا فلسفہ جہاد تلوار اور قتال سے شروع نہیں ہوتا بلکہ وہ اس عمل کو غلبہ دین کے آخری مرحلے کے طور پر دیکھتے ہیں جبکہ اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ نہ رہ جائے۔چنانچہ احمد شاہ ابدالی کو لکھے گئے خط میں بھی صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کا حوالہ دیتے ہوئے مسلم وغیر مسلم کے ساتھ معاملے میں حلم و بردباری کا مشورہ دیتے ہیں۔(۲۷)

جمہوری طرز سیاست

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور کے سیاسی تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ بادشاہت کا نظام اب فرسودہ ہو چکا ہے۔اس نظام میں قیصر و کسریٰ کی سی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں۔بقول پروفیسر غلام حسین جلبانی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دور بین نظروں سے یہ حقیقت مخفی نہ تھی کہ حکومت بس چند دنوں کی مہمان ہے۔(۲۸) چنانچہ وہ اس فرسودہ نظام کی تبدیلی یعنی ''فك كل نظام'' کی بات کرتے ہیں۔یعنی جب ملک کا داخلی نظام غلط بنیادوں پر ڈھلنا شروع ہو جائے اور اس میں فکری اور عملی طور پر فساد پیدا ہو جائے اور اس طرح وہ انسانیت کے لیے مضر ہو جائے تو اس کے خلاف انقلاب لانا انسانیت کو ایک بڑی مصیبت سے چھٹکارا دلانا ہے۔(۲۹) شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس دور میں بادشاہی نظام کی جگہ جمہوری نظام کی بات کی جب ابھی یورپ جمہوریت کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔وہ اہلِ دانش کی ایک مجلس کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے تمام ریاستی امور کو اجتماعی بنیادوں پر حل کرنے کا فلسفہ پیش کرتے ہیں اور ایک صالح جمہوری نظام قائم کرنے کے حوالے سے واضح تصور دیتے ہیں۔لیکن ان کا یہ تصور مروجہ جمہوری نظام (جو کہ سرمایہ داریت کا نمائندہ ہے) سے قطعی مختلف بلکہ کئی لحاظ سے متضاد بھی ہے۔وہ وحدتِ ملی کو قائم رکھتے ہوئے اقتدار کو نچلی سطح پر منتقل کرنے کے حامی ہیں۔(۳۰)

خلیفہ بطور بین الریاستی وفاق کی علامت

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سیاسی نظام کو چلانے کے لیے ایک قابل خلیفہ کو وسیع تر اختیارات دینے کے بھی حامی ہیں۔اپنے نظریہ امامت وخلافت کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ ہر ایسی تدبیر (نظام) کہ جس کے ذریعے اجتماعی وحدت صحیح طریقے پر برقرار رہے اور اجتماعی زندگی کے فوائد تمام افراد کو حاصل ہوتے

رہیں، حقیقت میں اسی کو امام کہا جائے گا۔ ان کے نزدیک امام سے مراد یہ نہیں کہ فرد واحد کی حکمرانی قائم ہو۔[۳۱] بلکہ وہ خلیفہ کو بین الریاستی (اسلامی ریاستوں کے) وفاق کی علامت سمجھتے ہیں۔[۳۲] جس کا کام اپنی ریاستوں میں علاقائی امیروں کا تقرر اور ان کی نگرانی کرنا ہے۔ خلیفہ کے اوصاف کی تعیین کے حوالے سے ان کے اور ماوردی (۹۷۴ء۔۱۹۵۸ء) کے نظریات میں کافی مماثلت نظر آتی ہے۔[۳۳]

عسکری وعدالتی اداروں کی مضبوطی

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ مستحکم سیاسی نظام کے لیے مضبوط اور اعلیٰ اخلاق سے مزین فوج کے ادارہ کو ضروری سمجھتے ہیں۔ چونکہ ان کے دور میں یہ ادارہ نااہل حکمرانوں کی وجہ سے زوال پذیر تھا اس لیے انہوں نے دو جہات میں کام کیا۔ اول یہ کہ انہیں خود میں اعلیٰ اخلاق پیدا کرنے اور ان رذائل سے بچنے کی تاکید کی[۳۴] دوسرے یہ کہ ان کی ازسرِ نو تربیت کی جائے اور فتنہ پردازوں کو معزول کر کے نئے لوگوں کو داخل کیا جائے اور ان کی تنخواہوں کا معقول انتظام ہونا چاہیے۔ اسی طرح وہ قاضی اور محتسب کے عہدوں پر بھی ایسے افراد کا تقرر چاہتے ہیں جو رشوت ستانی میں ملوث نہ رہے ہوں۔[۳۵] مذہبی اختلافات اور قتل وغارت گری کے مسائل سے نمٹنے کے لیے قانونی طاقت کے استعمال کو وہ ضروری قرار دیتے ہیں۔[۳۶] تاکہ امن وامان کی صورت حال متاثر نہ ہو۔ بنیادی طور پر امن وامان کا قیام اور عدل وانصاف کی فراہمی کو وہ اولین ترجیح دیتے ہوئے اسے ریاستی استحکام اور خوش حالی کی وجہ قرار دیتے ہیں۔

رفاہیت بالغہ کا انسداد

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور کی سماجی صورت حال کو سیاسی حالات سے مربوط کرتے ہوئے تہذیب وتمدن کے فساد کو امراء کی نفس پرستیوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ وہ عیاشی اور تکلف سے بھری زندگی کے مقابلے میں سادہ زندگی کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس حوالے سے فرماتے ہیں کہ یہ مصیبت (عیاشی ونفس پرستی) سوسائٹی کے بالائی طبقے ہی میں بند نہیں رہ جاتی بلکہ رفتہ رفتہ عوام میں بھی سرائیت کر جاتی ہے کیونکہ ان کا واسطہ امراء سے پڑتا ہے اور انہیں ان امراء کی ریس کرنی پڑتی ہے۔ ورنہ انہیں اپنے آقاؤں کی نگاہوں میں عزت واحترام نصیب نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کے درباروں میں قدر ہوتی ہے۔[۳۷] وہ حکمرانوں اور امراء کی تکلفات سے بھری زندگی کو ''رفاہیت بالغہ'' کا نام دیتے ہیں[۳۸] اور اس رفاہیت بالغہ سے بچنے کی تاکید کرتے ہیں کیونکہ اس سے حاجات بڑھ جاتی ہیں جس کا لازمی نتیجہ افلاس ہوتا ہے۔

اسلامی ریاست کے اساسی اصول

اسلامی نظامِ حکومت کا ذکر کرتے ہوئے وہ درج ذیل اصول بیان کرتے ہیں:

☆ زمین کا مالک حقیقی اللہ (اور ظاہری نظام کے لحاظ سے اسٹیٹ) ہے۔ باشندگان ملک کی حیثیت وہ

ہے جو کسی مسافر خانہ میں ٹھہرنے والوں کی۔ ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حق انتفاع میں دوسرے کی دخل اندازی قانوناً ممنوع ہے۔ (۳۹)

☆ سارے انسان برابر ہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مالک مُلک، ملک الناس، مالک قوم یا انسانوں کی گردنوں کا مالک تصور کرے۔ نہ کسی کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی صاحب اقتدار کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرے۔ (۴۰)

☆ اسٹیٹ کے سربراہِ کار کی وہ حیثیت ہے جو کسی وقف کے متولی کی۔ وقف کا متولی اگر ضرورت مند ہو تو اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ عام باشندۂ ملک کی طرح زندگی گزار سکے۔ (۴۱)

(ب) معاشی افکار ونظریات

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ محض ایک عالم دین اور صوفی ہی نہیں تھے بلکہ اپنے دور کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ وہ برعظیم کے پہلے مسلم اسکالر ہیں جنہوں نے اقتصادیات اور معاشیات کے قابلِ فہم اور قابلِ عمل اصول پیش کیے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے معاشی فکر کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

خالصہ اور جاگیر کا مسئلہ

مسلمان حکمرانوں کے دورِ عروج میں مرکز اپنے معاشی استحکام کے لیے دو طریقے بروئے کار لاتا تھا۔

☆ پہلا طریقہ خالصہ کا تھا۔ اس سے مراد وہ علاقہ تھا جو براہِ راست مرکزی حکومت یعنی بادشاہ کے تحت ہوتا تھا۔ اس کے محاصل بادشاہ اپنے افسران کے ذریعے وصول کرتا تھا۔

☆ اس کے برخلاف جاگیر کا علاقہ ہوتا تھا، جس کے محاصل جاگیردار وصول کرتے تھے اور جس کا براہِ راست مرکزی حکومت سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔

مرکز کی معاشی خوش حالی کے لیے ہر صاحب بصیرت فرماں روا کی کوشش ہوتی تھی کہ خالصہ کا علاقہ بڑھایا جائے اور جاگیرداری کو کم کیا جائے۔ ایسی صورت میں بادشاہ جاگیرداروں کے رحم وکرم پر نہیں رہتا تھا۔ اس کے برعکس جاگیر کا علاقہ بڑھانے سے مرکزی حکومت کے استحکام میں فرق آجاتا ہے، سلطنت کے اجزاء میں نظم وضبط کا اعلیٰ معیار قائم نہیں رہ سکتا، مرکزی حکومت جاگیرداروں کے رحم وکرم پر ہوتی ہے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں خالصہ کے علاقے میں کافی کمی آگئی تھی جس سے مرکز کی اقتصادی صورت حال کافی متاثر ہوئی تھی۔ اس لیے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا خیال تھا کہ خالصہ کا علاقہ وسیع ہونا چاہیے۔ چنانچہ آپ رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

> ''خالصہ کو کشادہ تر کرنا چاہیے، خصوصاً وہ علاقہ جو دہلی کے اردگرد ہے، آگرہ، حصار اور دریائے گنگ اور حدودِ سرہند تک سب کا سب علاقہ یا اس میں کا اکثر خالصہ ہو، کیونکہ امورِ سلطنت میں ضعف کا سبب خالصہ کی کمی اور خزانہ کی قلت ہوا کرتی ہے۔'' (۴۲)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں خالصہ کا علاقہ دہلی سے پالم تک رہ گیا تھا۔ نااہل حکمرانوں کی سستی ملاحظہ فرمائیں کے اس مختصر سے علاقے کو بھی ٹھیکہ پر دیدیا گیا تھا۔(۴۳) اس ٹھیکہ دینے کے رواج سے ٹھیکہ داروں کے تو دن پھر گئے لیکن بے چارے عوام پس کر رہ گئے اور بھاری ٹیکسوں تلے دب گئے۔ اس کا فوری نوٹس لیتے ہوئے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بادشاہ وقت کو لکھا کہ:

''خالصہ سے ٹھیکہ دہندگی کی رسم موقوف کردی جائے.....ٹھیکہ دینے میں ملک خراب ہوتا ہے اور رعیت پامال وبدحال ہوجاتی ہے۔''(۴۴)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور کے خودمختار صوبوں کی آمدنی یوں بیان کی ہے:

- ☆ جاٹوں کے علاقہ کی آمدنی ایک کروڑ روپیہ
- ☆ راجپوتانہ کی آمدنی دو کروڑ روپیہ
- ☆ بنگال کی آمدنی ایک کروڑ روپیہ
- ☆ صوبہ اودھ کی آمدنی دو کروڑ روپیہ

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق ہندوستان کی محصولات اس وقت بھی سات آٹھ کروڑ سے کم نہیں بشرطیکہ غلبہ وشوکت موجود ہو ورنہ ایک کوڑی بھی ملنا مشکل ہے۔(۴۵) لیکن ان کے دور میں اقتصادی حوالے سے مرکز اس قدر کمزور اور ناتواں ہو چکا تھا کہ بقول شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سلطنت کا بجز نام کے اور کچھ باقی نہ رہا تھا۔ انتظامی کمزوری کی وجہ سے ریاستی ادارے تباہ وبرباد ہوگئے اور حکومتی ترجیحات تبدیل ہوکر رہ گئیں۔

اقتصادی عدم توازن کے اسباب

زمینداری اور جاگیرداری کا وہ نظام جس میں کاشت کاروں پر ظلم ہوتا ہے، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک باطل اور قابلِ نفرت نظام ہے اور اس کو وہ قیصر وکسریٰ کے نظام کے مشابہہ قرار دیتے ہیں۔(۴۶) اس کے فوراً بعد شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ آج ہندوستان کے جو حالات ہیں قیصر وکسریٰ کا زمانہ بھی اس کے سامنے کچھ نہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قسم کے نظام کو ختم کیا جائے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک جاگیرداری اور سرمایہ داری سے اقتصادی عدمِ توازن پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اخلاقی وروحانی کمالات اور ترقی کے لیے اقتصادی اصلاح سب سے بڑی ضرورت ہے۔ وہ سوسائٹی کی اقتصادی اصلاح کو انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا اہم جزو قرار دیتے ہیں۔(۴۷)

آجر واجیر کا باہمی معاہدہ عمرانی

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تجارت وصنعت میں آجر واجیر کے باہمی معاہدے کو 'تعاون باہمی' اور ''عدل عمرانی'' پر قائم کرتے ہیں۔ اس اصول کی رو سے نہ تو کوئی شخص کسی کا نوکر ہے اور نہ کوئی آقا، نہ کوئی مزدور ہے اور نہ کوئی سیٹھ بلکہ دونوں ایک دوسرے کے مددگار ہیں اور دونوں کا ایک دوسرے سے معاہدہ ہوتا ہے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کارِ معیشت میں ''تعاونِ باہمی'' کو اس درجہ اہمیت دیتے ہیں کہ ان کے نزدیک

ترقی اموال کے وہ تمام ذرائع جو تعاون کی روح سے خالی ہوں اصول فطرتِ انسانی کے لحاظ سے بالکل ناجائز اور تمدن کے منافی ہیں۔[۴۸] چنانچہ وہ قمار بازی، سودی کاروبار، احتکار، اکتناز اور اسی طرز کی دیگر تمام صورتوں کو ناجائز قرار دیتے ہیں کیونکہ یہ فطرتِ انسانی کے خلاف ہیں۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مضاربت اور شراکت کو ''تعاونِ باہمی'' کے اصول کے دائرے میں لاکر اس درجہ خوبصورت بحث کی ہے کہ جس سے آجر واجیر کے جملہ باہمی مناقشات کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

محنت اور سرمایہ کا باہمی تعلق

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی فکر میں محنت کو سرمایہ پر اہمیت دیتے ہیں۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سرمایہ کے مخالف ہیں۔ بلکہ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سرمایہ اگر محنت کے ساتھ تعاون کا کردار ادا کرتا رہے تو درست ہے لیکن اگر سرمایہ اصل بن جائے اور محنت اس کے تابع بن جائے تو ایسا معاشی نظام درست معاشی نظام نہیں ہے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مزدور کاشتکار اور وہ افراد جو ملک اور قوم کے لیے دماغی کام کریں، دولت کے اصل مستحق ہیں۔ نیز جو معاشرہ محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے اور جس میں مزدوروں اور کاشت کاروں پر بھاری ٹیکس لگائے جاتے ہوں، ملک اور قوم کا دشمن ہے۔[۴۹]

وسائل معاش کی تقسیم کے اساسی اصول

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ وسائل معاش، احتیاجات کی تسکین کے لیے جب استعمال کیے جائیں گے تو تین بنیادی چیزیں پیشِ نظر رکھی جائیں گی:

☆ پہلی چیز یہ کہ آدمؑ سے لے کر آج تک نوعِ انسانی کی بنیادی انسانی ضمیر کے جو بنیادی اخلاقِ فاضلہ اور بنیادی رویے ہیں ان کی بنیاد پر انسانی احتیاجات کی تسکین ہونی چاہیے۔

☆ دوسری بات یہ کہ جس دور میں انسانیت کی معاشی احتیاجات کی آپ تسکین کرنا چاہتے ہیں اس دور کے تجرباتی علوم، اس دور کی سائنس، اس دور کے پیداواری رشتے کی بنیاد پر نوعِ انسانیت کی جدید دور کی ضروریات کے پیشِ نظر اس کی احتیاجات کی تکمیل کا نظام ہونا چاہیے۔

☆ تیسری بات یہ کہ وسائلِ معاش سے کل انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے لیے لازمی اور ضروری ہے کہ وہ مفادِ عامہ کی بنیاد پر ہونے چاہئیں۔

معاشی خوشحالی کے اخلاقی وتمدنی اثرات

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انقلاب کو نزولِ قرآن کا مقصد قرار دیتے ہوئے معاشی ناانصافی اور عدمِ مساوات کی برائیوں کو بھی کھول کر بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''جس سوسائٹی میں اقتصادی امان نہ ہو اس میں طرح طرح کے روگ پیدا ہوجاتے ہیں۔ نہ وہاں عدل وانصاف قائم ہوسکتا ہے اور نہ مذہب اپنا اچھا اثر ڈال سکتا ہے۔''[۵۰]

ان کے نزدیک مزدوروں اور کاشتکاروں کے کام کے اوقات محدود و متعین کیے جائیں۔[۵۱] انہیں اتنا وقت ضرور ملنا چاہیے کہ وہ اپنی روحانی اور اخلاقی اصلاح کر سکیں اور ان میں اپنے مستقبل کے بارے میں غور وفکر کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے اقتصادی توازن ایک ضروری امر ہے اور ہر انسانی جماعت کو ایک ایسے اقتصادی نظام کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی ضروریات زندگی کا کفیل ہو۔ جب لوگوں کو اپنی معاشی ضرورتوں سے فراغت نصیب ہوتی ہے تو پھر وہ اپنے خالی وقت میں جو ان کے پاس کسبِ معاش کے بعد بچ رہتا ہے، زندگی کے ان شعبوں کی ترقی اور تہذیب کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں جو انسانیت کا اصل جوہر ہے۔ چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں کہ:

''انسانوں کے اجتماعی اخلاق اس وقت برباد ہو جاتے ہیں، جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے۔ اس وقت وہ گدھوں اور بیلوں کی طرح روٹی کمانے کے لیے کام کریں گے۔''[۵۲]

ریاست کی اقتصادی ذمہ داریاں

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ریاست پر جو اقتصادی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

کفالتِ عامہ کا نظام وضع کرنا

کفالتِ عامہ کے ذیل میں ریاست کا فرض ہے کہ وہ سوسائٹی کے ہر فرد کے لیے بنیادی ضروریات کا اہتمام کرے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

''روٹی، کپڑا اور مکان اور ایسی استطاعت کہ نکاح کر سکے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کر سکے، بلا لحاظ مذہب و نسل ہر بندہ کا پیدائشی حق ہے۔''[۵۳]

اسی طرح ملک کے ہر باشندے کا حق ہے کہ خواہ وہ کسی بھی مذہب یا نسل سے تعلق رکھتا ہے کہ اس کی جان و مال اور عزت و ناموس کی حفاظت کی جائے اور اس کو عدل و انصاف سے استفادے کا بغیر کسی معاوضے کے حق دیا جائے۔ حقوق شہریت میں یکسانیت اور حقوق ملکیت میں آزادی کا حق حاصل ہو۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ریاست کو اس بات کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں کہ وہ محروم المعیشت افراد کی کفالت کرے۔ اس حوالے سے ریاست اگر ضرورت محسوس کرے تو مناسب قانون سازی کر کے (جس کے نظائر فقہاء کے ہاں ملتے ہیں) مالداروں کے مال میں تصرف کا حق بھی رکھتی ہے تاکہ معاشرے کا کوئی طبقہ محروم نہ رہے۔

☆ معاشی استحکام کا اہتمام کرنا

معاشی استحکام کے حوالے سے وہ ریاست کی ذمہ داری قرار دیتے ہیں کہ ریاست زراعت اور صنعت کی ترقی کے لیے مناسب اقدامات کرے۔ کسانوں کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ کسی قطعہ زمین کو خالی اور بے کار نہ چھوڑیں۔ اسی طرح کاشتکاروں اور صنعت کاروں کے لیے ایسی ترغیبات اور آلات پیدا کیے جائیں کہ وہ اپنے شعبوں کو ترقی دے سکیں۔[۵۴] وہ تاجروں کو سہولیات کی فراہمی، پرامن ماحول اور درآمدات و برآمدات میں قومی ترجیحات کو مدنظر رکھنا بھی ریاست کی ذمہ داری قرار دیتے ہیں۔ وہ ایسی

تعمیرات کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں جن کا تعلق رفاہِ عامہ کے امور سے ہو۔ چنانچہ مہمان خانے، پانی کے کنویں پلوں اور سڑکوں کی تعمیر کو ریاست کی اولین ترجیح قرار دیتے ہیں۔ وہ منڈی کے بھاؤ پر نظر رکھنے اور قیمتوں کے تعین میں عوامی مفاد کے تحفظ کو بھی ریاست کی ذمہ داری قرار دیتے ہیں۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بہت سے لوگ کسی عذر کی بنا پر جائز ذرائع سے کمائی کرنے میں ناکام رہتے ہیں، ان کی کفالت اور روزگار کی فراہمی ریاست کی ذمہ داری ہے۔(۵۵) اسی طرح پیشوں کی تقسیم کے حوالے سے مناسب منصوبہ بندی بھی ریاست کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔

☆تقسیم دولت کے تفاوت کو کم کرنا

تقسیم دولت کے تفاوت کو کم کرنے کے حوالے سے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فکر یہ ہے کہ دولت کے بہاؤ کا رخ دولت مندوں سے غریبوں کی طرف ہو۔(۵۶) تاکہ تمام طبقات اس سے مساوی طور پر استفادہ کر سکیں۔ وہ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف ہیں اور ریاست کی ذمہ داری قرار دیتے ہیں کہ منصفانہ اور مساویانہ تقسیمِ دولت کا اہتمام کرے۔ اس تنازع میں اگر ریاست محسوس کرے کہ زراعت، تجارت یا صنعت میں دولت کا بہاؤ امیروں کی طرف ہے اور اس سے سرمایہ داری نظام تشکیل پا رہا ہے تو وہ قانون سازی کر کے وسائل کے مساویانہ تقسیم کا حق رکھتی ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی (۱۹۰۱ء۔۱۹۶۳ء) لکھتے ہیں کہ:

> ''حق معیشت کی مساوات تسلیم کر لینے کے بعد یہ خطرہ بھی بے معنی ہے کہ درجاتِ معیشت میں فطری تفاوت کا اعتراف مذموم سرمایہ داری کی راہ کھولنے کے مترادف ہے۔''(۵۷)

انفرادی واجتماعی ملکیت کا مسئلہ

انفرادی واجتماعی ملکیت کا مسئلہ بھی ہمیشہ سے اہلِ علم کا خصوصی موضوع رہا ہے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر اس باب میں یہ ہے کہ ملکیت کا مفہوم اشیاء سے نفع اٹھانے کے بنیادی حق تک محدود ہے اور اپنی اصل میں تمام اشیاء اجتماعیت کے لیے وقف ہیں۔(۵۸) شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ ملکیت میں اجتماعیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ انفرادی ملکیت کے حوالے سے وہ ان تمام ذرائع کا رد کرتے ہیں جن سے اجتماعی مفادات متاثر ہو رہے ہوں۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ نے انفرادی ملکیت کے حوالے سے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نقطۂ نظر کو اس انداز میں پیش کیا ہے:

> ''انفرادی ملکیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس پر ایسی قیود اور پابندیاں عائد کی جائیں جن سے اس کا مفاد ''اجتماعی مفاد'' کے زیرِ اثر آجائے اور خود غرضانہ جراثیم کو کسی قسم کی مدد نہ ملنے پائے اور اس کو قائم کرنے کے لیے شخصی زمینوں، ذاتی کمپنیوں اور ذاتی تجارتوں سے متعلق بیان کردہ احکام کو نافذ کیا جائے۔''(۵۹)

انسان کی مادی وروحانی احتیاجات

سرمایہ دارانہ نظام میں سارا زور فرد کی انفرادیت اور ذاتی ملکیت پر دیا جاتا ہے۔ اس نظام کے

بنیادی فلسفے میں مادی بنیادوں پر سرمائے کی ذاتی ملکیت اور اس کے مفادات کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ اشتراکی نظام میں انسانی معاشروں میں پہلے کیپٹل کی طاقت کا اظہار ہوتا ہے اور پھر اس کے ردعمل میں مزدوروں کی اجتماعی طاقت کا اظہار ہوتا ہے اور ان کے باہمی جدل سے اشتراکیت پر مبنی نظام وجود میں آتا ہے۔ سرمایہ داریت اور اشراکیت میں مادیت پر تو زور ہے مگر انسان کی روحانی احتیاجات کا ان دونوں نظاموں میں کوئی سامان نہیں۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی کے دونوں رخ مادی اور روحانی کو باہم مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ چنانچہ آپ مادی حوالے سے نظام ارتفاقات کے تحت سماج کے ارتقاء کے چار مدارج بتلاتے ہیں۔

- ☆ ارتفاقِ اول (ابتدائی زندگی)
- ☆ ارتفاقِ دوم (قصباتی زندگی)
- ☆ ارتفاقِ سوم (قومی زندگی)
- ☆ ارتفاقِ چہارم (بین الاقوامی زندگی)

اسی طرح روحانی حوالے سے آپ چار بنیادی اخلاق کو تمام ادیان کا بنیادی مقصد قرار دیتے ہیں۔ جسے آپ ''اخلاق اربعہ'' کا نام بھی دیتے ہیں۔

- ☆ طہارت (روح بالیدگی اور پاکیزگی)
- ☆ اخبات (خشوع وخضوع کا باعث)
- ☆ سماحت (اعلیٰ اخلاقی صفات کا حصول)
- ☆ عدالت (عدلِ اجتماعی اور اصلاحی امور)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جس انداز میں ان کی تشریح کی ہے اس سے سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام کی قباحتوں کے نتائج اور اثرات کے مقابلے میں ایک صالح اور متوازن نظام سامنے آتا ہے، جو قابلِ فہم ہونے کے ساتھ ساتھ قابلِ عمل بھی ہے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفے میں نوعِ انسانیت کی وحدت اور کائنات کی وحدت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور ان وحدتوں پر ذاتِ باری تعالیٰ کی وحدانیت کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے فلسفے کی روشنی میں وحدتِ نوعِ انسانی کی اساس پر نظریہ اجتماع پیش کرتے ہیں۔

معاشی نظام کے قرآنی اصول

کسی بھی معاشی نظام کے چار بنیادی اصول ہوتے ہیں۔

- ☆ پیدائش دولت
- ☆ صرف دولت
- ☆ تقسیم دولت

☆ تبادلہ دولت

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان اصولوں کو پیش نظر رکھ کر قرآنی تعلیمات کی روشنی میں درج ذیل اصول متعین کیے ہیں:

☆ پہلا اصول یہ ہے کہ جغرافیائی حدود میں رہنے والے تمام لوگوں کا ان وسائل پر حق ہے جس معیشت میں تمام لوگ برابر ہیں اور اس پر ایک مخصوص طبقہ حاوی نہیں ہوسکتا۔

☆ دوسرا اصول یہ ہے کہ انسانی فطری صلاحیتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں لہٰذا محدود انفرادی ملکیت کا تصور یہ نہیں کہ ساری قوم ایک ہی طرح کی روٹی، لباس اور مکان استعمال کرے۔

☆ تیسرا اصول یہ ہے کہ دولت کے ارتکاز کے لیے کوئی بھی عمل برداشت نہیں کیا جائے گا۔ نظام اس کی مخالفت کرے گا۔

☆ چوتھا اصول یہ کہ تمام عوامل کے درمیان ایسا توازن کیا جائے کہ ساری سوسائٹی یکساں طور پر ترقی کرے۔

معیشت اور سماج کا باہمی تعلق

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ وہ پہلے مسلم مفکر ہیں جنہوں نے معیشت اور سماج کے باہمی رشتے کو دریافت کیا۔ ارتفاقات کے ذیل میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر انتہائی محققانہ بحث کی ہے، جو ان کی کتب ''حجتہ اللہ البالغہ'' اور ''البدور البازغہ'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ چنانچہ معیشت اور سماج کے جن تہذیبی عوامل پر کارل مارکس (۱۸۱۸ء۔۱۸۸۳ء) نے اشتراکی نظام کی بنیاد رکھی تھی اس سے ایک سو سال قبل اس سے اعلیٰ درجہ کا فلسفہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پیش کر چکے تھے۔[۶۰] تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کارل مارکس کو پڑھنے سے پہلے اگر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فلسفہ پڑھا گیا ہو تو اس فلسفے کی عملی توجیہات کے حوالے سے بہت سے امور سمجھنا آسان ہوجاتے ہیں۔ اس حوالے سے مولانا عبید اللہ سندھی (۱۸۷۲ء۔۱۹۴۴ء) نے ان دونوں فلاسفرز کے معیشت اور تہذیب سے متعلقہ انسانیت پر مبنی فکر کو ایک عملی شکل کی صورت میں مرتب کیا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فلسفہ معیشت کارل مارکس کے مادی فلسفے سے مشابہت رکھتا ہے قطعی درست نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مارکس نے اپنے فلسفہ معیشت کی بنیاد اخلاقی اصولوں اور معاشی تقاضوں کے باہمی ٹکراؤ پر رکھی ہے۔ اس کے برعکس شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فلسفہ معیشت قرآن کریم اور انبیاء کی سنت پر قائم ہے۔ اس لیے فلسفہ ولی اللّٰہی میں معاشی ضروریات اور مذہب واخلاق کے متصادم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

معیشت اور اخلاق کا باہمی ربط

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اخلاقیات اور معیشت کے باہمی ربط پر بڑی عمدہ بحث کی ہے۔ چنانچہ

ان کا ماننا ہے کہ اخلاق، حالات سے پیدا ہوتے ہیں، محض علوم سے نہیں۔(۶۱) انہوں نے نہ صرف اخلاق کا تعلق معیشت کے ساتھ جوڑا، بلکہ عدل کو معاشی اور معاشرتی زندگی کی اساس قرار دیا۔(۶۲) سید ابوالحسن علی ندوی (۱۹۱۴ء۔۱۹۹۹ء) لکھتے ہیں کہ:

''شاہ ولی اللہ نے علمائے اخلاق اور ماہرین اقتصادیات میں پہلی مرتبہ علم المعیشت کا علم الاخلاق سے گہرا ربط ثابت کیا ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک جب یہ ربط ٹوٹ جاتا ہے تو معاشیات اور اخلاقیات دونوں کو شدید بحران سے واسطہ پڑتا ہے، جس کا اثر مذہب واخلاق، پرسکون زندگی، انسانوں کے باہمی روابط اور تمدن وتہذیب، سبھی پر پڑتا ہے۔''(۶۳)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ماننا ہے کہ جب انسان کو ذہنی سکون ملتا ہے، تو اس کے بعد وہ مذہب اور اخلاق کا متلاشی ہوتا ہے اور انسانیت کے بنیادی اخلاق کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اگر معاشی حالات بہتر ہوں گے تو اس سے عمدہ اخلاق پیدا ہوں گے۔ شاہ صاحب خود فرماتے ہیں کہ:

''انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت برباد ہوجاتے ہیں، جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کردیا جائے۔''(۶۴)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:

''انسان کی اجتماعی زندگی کے لیے ایک ایسا اقتصادی نظام ہونا چاہیے جو اس کی اقتصادی ضروریات کو پورا کرے۔ چنانچہ جب انسان اپنی حیوانی زندگی کی ضروریات سے مطمئن ہوں گے اور ان کے پاس روٹی کپڑے کے دھندوں سے کچھ فاضل وقت بچے گا تو پھر کہیں وہ اپنی اعلیٰ تر استعدادوں اور دوسرے بلند لطائف کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوسکیں گے۔''(۶۵)

(ج) تعلیمی افکار ونظریات

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تعلیمی افکار کے مطالعہ سے قبل ان کے دور کے علمی حالات کا اجمالی جائزہ لینا ضروری محسوس ہوتا ہے، تاکہ علم وفن کے فکری میدان میں ان کی مساعیٔ جمیلہ کا پتہ چل سکے۔

☆ ایران کی عقلیت پسندی سے ہندوستان متاثر ہورہا تھا۔
☆ قرآن وحدیث کے مقابلہ میں یونانی منطق وفلسفہ پر زور دیا جارہا تھا۔
☆ تقلیدی رجحان غالب تھا اور فقہ حنفی کی ضمنی تخریجات کا اسلوب عروج پر تھا۔
☆ سیاسی ومعاشی زوال کی طرح علمی زوال کی واضح نشانیاں نہیں مل رہی تھیں اور علمی افق پر بھی دھند چھایا ہوا تھا۔(۶۶)

حصولِ علم کے ذرائع اور مقاصد

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس بات کو سمجھتے تھے کہ ایک فرد تمام علوم پر حاوی نہیں ہوسکتا اور جلد یا بدیر ان علوم

کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ چنانچہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے علوم کی درجہ بندی کی ہے۔ اسی طرح شاہ صاحب کے نزدیک حصول علم کے بھی تین ذرائع ہیں۔

☆ نقل (گذشتہ انسانوں کے تجربات اور تحقیقات)
☆ عقل (حواس خمسہ کے ذریعہ سے کوئی نئی تحقیق)
☆ کشف (اللہ کے حکم سے پوشیدہ حقائق کا دل پر القاء ہو جانا)(۶۷)

ایک صوفی ہونے کے ناطے وہ وجدانی اور مابعد الطبعی علوم سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں(۶۸) جس میں ان کے دور کے علمی و روحانی تقاضوں کا بہت دخل تھا۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک علم کا مقصد غائی یہ ہے کہ معاشرہ میں حرکت اور ترقی کے میلانات ہوں اور انہیں افراد اور معاشرہ کو بہتر بنانے کے لیے کام میں لایا جائے۔ ان کے نزدیک تعلیم کا اصل مقصد فطری ادراک کی تربیت ہے تا کہ انسان معرفتِ الٰہی کے قابل ہو جائے۔ انہوں نے اپنے معاشی نظریات کی روشنی میں تعلیم کا یہ مقصد بھی واضح کیا کہ انسان کی روحانی اور جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ اس کی دنیاوی زندگی کی ترقی بھی ضروری ہے تا کہ فارغ التحصیل لوگ اپنے معاش کے حصول میں دوسروں کے دست نگر نہ رہیں۔ اپنے ایک مکتوب میں آپ نے مساجد کے اماموں اور دین کا کام کرنے والے لوگوں کے لیے مناسب تنخواہوں کے تقرر کا ذکر کیا ہے تا کہ وہ بہتر زندگی گزار سکیں۔(۶۹)

علومِ نقلیہ وعقلیہ کا امتزاج

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں علومِ نقلیہ کی اصلاح کی وہیں علومِ عقلیہ کے حصول پر بھی زور دیا۔ چنانچہ انہوں نے ''مدرسہ رحیمیہ'' کے نصاب میں ان دونوں علوم کا حسین امتزاج قائم کیا تھا۔ اس حوالے سے محمد رحیم بخش دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:

> ''شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندانوں میں علومِ نقلیہ کے ساتھ ساتھ علومِ عقلیہ کا بھی رواج تھا اور جناب شاہ ولی اللہ کی درسگاہ میں جہاں حدیث و تفسیر کو بڑے زور و شور سے پڑھایا جاتا تھا وہاں منطق و ریاضی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شاہ عبدالعزیز چھوٹی عمر میں ایک لائق ریاضی دان اور قابل منطقی بن گئے تھے اور تواریخ و جغرافیہ میں اپنا نظیر نہ رکھتے تھے..... جناب شاہ ولی اللہ کو ان علوم سے خاصی دلچسپی تھی اور تواریخ و جغرافیہ کے جوہروں کی کنجیاں آپ کے ہاتھ میں تھیں۔''(۷۰)

صنعتی علوم وفنون کی افادیت

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفہ تعلیم میں صنعتی علوم وفنون کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ خواجہ محمد سعید کے مطابق برصغیر پاک و ہند میں سب سے پہلے شاہ ولی اللہ نے اسلامی تعلیمات میں فنی اور صنعتی تعلیم کو شامل کرنے کا نظریہ پیش کیا۔(۷۱) ان کے روحانی مکاشفات سے صنعتی علوم وفنون کے تابناک مستقبل کا پتہ چلتا ہے۔ وہ آنے والے صنعتی دور کو ''ملاءِ اعلیٰ'' کی مرضیات بتاتے ہیں(۷۲) اور نظری علوم

سے ہٹ کر اس کی تحصیل کو بھی وقت کی ضرورت بتاتے ہیں۔ وہ ایسی تعلیم کے قائل تھے جس سے ملک وقوم کو فائدہ حاصل ہو۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''جب تک کوئی شخص ملک وقوم کے لیے کام نہ کرے ملک کی دولت میں اس کا کوئی حق نہیں۔''(۷۳)

دینی ودنیاوی تعلیم کی جداگانہ تقسیم کی نفی

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمی فکر میں دین اور دنیا کی جداگانہ تعلیمی تقسیم کا تصور ہمیں نظر نہیں آتا کیونکہ یہ تقسیم بعد کی پیدا کردہ ہے۔ تاہم وہ جدید علوم سے بے خبر ہرگز نہیں تھے بلکہ ان کی تحصیل کی دعوت دیتے تھے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور کے علومِ نقلیہ اور علومِ عقلیہ میں ایسی تطبیق دی کہ ان کا باہمی تضاد رفع ہوگیا۔ چنانچہ وہ جدید علوم کو آلات ووسائل قرار دیتے ہیں اور ان کے استعمال کے حوالے سے صحیح دینی شعور کی روشنی میں اصول مرتب کرنے پر زور دیتے ہیں(۷۴) گویا وہ ان دیگر علوم وفنون کی اہمیت کے قائل ہونے کے ساتھ ساتھ اسے دین کے اجتماعی تقاضوں کا پابند قرار دیتے ہیں۔

تحصیلِ علم اور زبان کا مسئلہ

یہ بات درست ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے علوم کی تحصیل میں عربی زبان کو بڑی اہمیت دی ہے تاہم اس کی بنیادی وجہ اسلام کے اولین مآخذ کا عربی زبان میں ہونا ہے۔ تاہم وہ کسی زبان کی تحصیل کی ممانعت نہیں کرتے بلکہ ہر وہ زبان جو حصولِ علم کا ذریعہ اور فہم وشعور کا باعث بن سکے اس کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال قرآنِ کریم کا پہلا مکمل فارسی ترجمہ ہے جس کی روایت شاہ صاحب نے ڈالی۔ اسی طرح شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ملتا ہے کہ انہوں نے عبرانی زبان سیکھی تھی(۷۵) شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ کے اردو تراجم بھی اسی روایت کا تسلسل تھا۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک زبان کے حامی اور دوسری زبان کے مخالف نہیں تھے۔

آج کے مروّجہ مدارس میں ایک طرف تو انگریزی اور اسی طرز کی دیگر یورپی زبانوں سے نفرت کے جذبات پائے جاتے ہیں جبکہ دوسری طرف عربی اور فارسی زبان کی تفہیم کی کمی اور مادری زبان نہ ہونے کی وجہ سے مشکلات پیش آرہی ہیں۔ چنانچہ عربی زبان سیکھنے کے لیے ابتدائی درجہ میں جو کتب پڑھائی جاتی ہیں وہ فارسی میں ہوتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ طالبِ علم تفہیم وتعبیر کے حوالے سے ناقص فہم رہ جاتا ہے۔ لیکن شاہ صاحب کا نقطۂ نظر اس حوالے سے بالکل مختلف ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

> ''اگر کتاب کی عبارت طالبِ علم کی مادری زبان نہ ہو تو استاد کے لیے لازم ہے کہ پہلے اس کی تشریح مادری زبان میں کرکے طالب پر اس کا مطلب واضح کرے تاکہ طالبِ علم اس کے مفہوم کو آسانی سے سمجھ سکے۔ ورنہ وہ زبان کے پیچھے ہی لگا رہے گا اور موضوع کے اصل مفہوم سے کوسوں دور رہے گا۔''(۷۶)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تعلیم وتدریس کے حوالے سے اپنی کتاب ''رسالہ دانشمندی'' میں پندرہ اصول بیان کیے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے تعلیمی عمل کو بہتر اور موثر بنایا جاسکتا ہے۔ اس رسالہ کے اختتام پر انہوں نے واضح کیا ہے کہ یہ اصول معقولات (عصری علوم) اور منقولات (دینی علوم) دونوں کے لیے ہیں۔ راقم بلا مبالغہ یہ بات کہہ سکتا ہے کہ تعلیم وتدریس کے حوالے سے دنیا آج جس تحقیق پر کھڑی ہے شاہ صاحب کے ان اصولوں سے آگے نہیں بڑھ پائی۔ اگرچہ بعض مقامات پر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے طریق تعلیم پر ابنِ خلدون کے اثرات بھی نظر آتے ہیں لیکن نصاب سازی اور فہم وبصیرت کے لحاظ سے وہ ابنِ خلدون (۱۳۳۲ء۔۱۴۰۶ء) سے بہت آگے نظر آتے ہیں۔

نصابِ تعلیم اور تحقیق وتدقیق

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور کے مروّجہ نصاب پر شدید تنقید کی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ علماء کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''اے کم عقلو! تم اپنے آپ کو علماء کے مقتدر نام سے یاد کرتے ہو۔ تم یونانی، صرف نحو اور علم معانی جیسے علوم میں مشغول ہو گئے ہو اور تم نے یقین کر لیا کہ بس دینی علوم یہی ہیں۔''(۷۷)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق جامد تعلیم کی وجہ سے نہ صرف برعظیم کے مسلمانوں میں بلکہ اُمتِ اسلامیہ میں غور وفکر اور تحقیق کی صلاحیت بہت ہی کم ہوتی جارہی ہے۔ لہٰذا ایسا نصاب مرتب کیا جائے جو مسلمانوں کو غور وفکر پر ابھارے۔ انہوں نے اپنے دور کی عام روِش سے ہٹ کر ''فن کتاب دانی'' کو خصوصی اہمیت دی اور تحقیق وتدقیق پر زیادہ زور دیا۔ ان کا ماننا تھا کہ قرآن مجید جو اسلامی تعلیمات کا منبع ہے خارج از نصاب ہے۔ اصل کتاب کی بجائے شروحات، حواشی اور تعلیقات کو نصاب میں زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور طلباء کی ساری صلاحیت انہی کے حل میں ضائع ہو جاتی ہے۔ اس حوالے سے خواجہ محمد سعید لکھتے ہیں کہ:

> ''درسِ نظامی کا جو نصاب اسلامی مکاتب میں پڑھایا جاتا تھا وہ وقت کے تقاضوں کے مطابق نہ تھا جس سے طلباء جمود کا شکار ہو رہے تھے۔ اس سے کسی قسم کی ذہنی نشوونما نہیں ہو پا رہی تھی۔ شاہ صاحب کا خیال تھا کہ مروّجہ نظامِ تعلیم اسلامی نقطۂ نظر سے کردار کی تشکیل کے قابل نہیں۔ ان کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے علمی جمود کو توڑا، اندھی تقلید ترک کی، اجتہاد کے بند دروازے کو کھولا اور فکر ونظر کی نئی راہیں ملتِ اسلامیہ کو عطا کیں۔''(۷۸)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور کے نصابِ تعلیم اور اس کے معاشرتی اثرات سے مطمئن نہیں تھے اور اخلاقی تعلیم کے مثبت سماجی اثرات لیے حقیقی مذہبی تعلیم پر زور دیتے تھے۔ اس لیے کہ مذہبی تعلیم سب سے زیادہ بھائی چارہ، رواداری، وسیع النظری اور وسیع القلب ہونے کی تلقین کرتی ہے۔ حکیم محمود احمد برکاتی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے والد شاہ عبدالرحیم دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے قائم کردہ ''مدرسہ رحیمیہ'' کے نصابِ تعلیم میں ترمیم کی تھی اور قرآن کریم کو جزو نصاب بنایا تھا۔(۷۹)

تعلیمی اصول ومقاصد کے اساسی تصورات

تعلیمی اصول ومقاصد کا ذکر کرتے ہوئے شاہ صاحب تین بنیادی واساسی تصورات پیش کرتے ہیں:

☆ پہلا بنیادی تصور یہ ہے کہ ان کے نزدیک پورے انقلابی نظریات میں دین کی فہم واشاعت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک انسانی زندگی کی اصل اور مکمل رہنمائی دین کے ذریعے ہی ممکن ہوسکتی ہے۔

☆ دوسرا بنیادی تصور یہ ہے کہ معاشرتی امن وامان اور تعمیری ترقی کے لیے اہلِ علم وسیاست کے مابین مفاہمت ازحد ضروری ہے اگرچہ دونوں کا میدانِ عمل جدا ہے اور اپنے اپنے دائرۂ کار میں دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ باہم مفاہمت کے ساتھ کام کرنا چاہیے نہ کہ وہ ایک دوسرے کے مدمقابل ہوکر کام کرنے لگیں۔

☆ تیسرا بنیادی تصور یہ ہے کہ انسان کا مقصد اصل یہ ہے کہ وہ دائمی اور ابدی سعادت کے حصول کی بھرپور کوشش کرے۔ اس کے لیے تمام حیوانی قوتیں، نفسانی خواہشات، نفسِ ناطقہ کے تابع ہو جانے سے سعادت کا راستہ واضح ہوجاتا ہے۔(۸۰)

(د) روحانی افکار ونظریات

انسان کی انفرادی واجتماعی اصلاح کے حوالے سے تصوف کے روحانی اثرات کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی فکر کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں حقیقت وعملیت پسندی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے دور کے روایتی اور غیر شرعی تصوف کا انکار کرتے ہوئے تصوف کے حقیقی اور عملی تصورات کو اجاگر کرتے ہیں۔ ذیل میں ہم شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی افکار ونظریات کا جائزہ لیتے ہیں۔

جاہل علماء وصوفیاء پر تنقید

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا دور جاہل صوفیاء اور علماء سوء سے خالی نہ تھا۔ خوشحال خان خٹک جس کا انتقال شاہ صاحب کی پیدائش سے چند سال قبل ہوا تھا اپنے دور کے صوفیاء اور علماء کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

> ''جو کوئی کنز وقدوری پڑھ لیتا ہے وہ ملا بن بیٹھتا ہے، پھر ہر حلال وحرام کو اپنے لیے جائز قرار دے لیتا ہے..... ناجائز مال لے کر شریعت کی جڑیں کاٹتے ہیں..... مسجد میں آکر پانچ وقت اذان دیتے ہیں لیکن اگر زکوۃ وفطرہ نہ ملے تو مسجد کو ڈھا بھی دیتے ہیں۔ تعویز دیتے ہیں اور جھوٹ موٹ سب کچھ لکھ دیتے ہیں..... صرف کلاہ، پگڑی اور شجرہ دیکھ کر پیری مریدی کی جاتی ہے۔ اگر پیری مریدی یہی ہے تو یہ اس کی بعد اڑانا ہے۔''(۸۱)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں علماء اور صوفیاء انبیاء کرام کے اسوہ سے ہٹ گئے تھے۔ چنانچہ علماء نے لایعنی اور دور از کار ابحاث کو اپنی علمیت کا معیار قرار دیا ہوا تھا جبکہ صوفیاء نے کرامات وشعبدہ

بازی کو تصوف کی معراج سمجھ رکھا تھا۔ یہ دونوں طبقات دین کے نام پر دنیا پرستی کے فروغ میں پیش پیش تھے۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان دونوں طبقات پر کڑی تنقید کی ہے۔ انہوں نے ان صوفیاء اور علماء کو یہود ونصاریٰ کے احبار ورہبان سے تشبیہ دی ہے اور کہا ہے کہ اگر احبار یہود کی حالت دیکھنا چاہو تو آج کل کے علماء کو دیکھ لو اور اگر عیسائیوں کا نقشہ چاہتے ہو تو آج کے مشائخ اور ان کی اولاد کو دیکھ لو(۸۲) شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''التفہیمات الالٰہیہ'' میں ان غلط کار علماء، نام نہاد صوفیاء اور بے علم مشائخ کی اولاد کو ان کی کوتاہیوں اور غلط روش پر متنبہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''میں دین میں خشکی اور سختی کی راہ اختیار کرنے والوں سے پوچھتا ہوں اور واعظوں، عابدوں اور ان کج نشینوں سے سوال ہے جو خانقاہوں میں بیٹھے ہیں کہ بہ جبر اپنے اوپر دین کو عائد کرنے والو! تمہارا کیا حال ہے۔''(۸۳)

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان کے دور کے صوفیاء درحقیقت اس زوال پذیر مسلم معاشرہ کی نمائندگی کر رہے ہیں جو طوائف الملوکی کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے جاہل صوفیاء کو راہ زن اور ڈاکو قرار دیا اور انہیں دجالوں، کذابوں اور فتنہ پردازوں میں گردانا ہے۔ وہ اپنے ایک خط میں ایسے بے حیا صوفی سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں جو رفع تکلیف کے لیے حیلہ کرتا ہے اور اپنے مجازی امور میں توقف نہیں کرتا(۸۴) شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس قسم کی حرکات اور صوفیاء سے بچنے کی تلقین کی ہے اور عوام کو ان کی دھوکہ دہی اور کرامت فروشی کے فریب میں نہ آنے کا کہا ہے۔ تاہم وہ تصوف کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ اسے ایک نعمت عظمیٰ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اگرچہ صوفیائے کرام کے اخلاقی محاسن کا تتبع بلاشبہ ایک نعمت عظمیٰ ہے، تاہم ان کی رسومات (جو خلافِ شریعت ہیں) کارآمد نہیں۔ ایسے صوفی جنہیں قرآنِ کریم اور حدیث نبوی سے کوئی علاقہ نہیں حقیقتاً دین کے چور اور ڈاکو ہیں۔''(۸۵)

روحانیت کا مقصد اجتماعی تزکیہ

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ تصوف ان کے زمانے کے تصوف سے بالکل مختلف تھا۔ انہوں نے اسے عام خانقاہی نظام سے ممیّز کرنے کے لیے اپنے فلسفہ کی باقی مدات کی طرح براہِ راست دورِ نبوت سے اخذ کیا۔ چنانچہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی فکر کی بنیاد اجتماعیت وانقلاب پر ہے۔ اسے وہ انسانوں کے اخلاق بلند کرنے اور اسے روحانیت میں پختہ کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں تاکہ وہ معاشرے کا نظم اچھے طریقے سے چل سکے۔ وہ انفرادی اصلاح کے محدود تصور کی بجائے اجتماعی تزکیہ کو اپنے روحانی فکر کی بنیاد بناتے ہیں۔ چنانچہ ایسا خانقاہی نظام جو انفرادی اصلاح تو کر رہا ہو مگر اس کے نتیجے میں ایک اجتماعی فکر کی تشکیل میں ناکام ہو اور انسان کی روحانی زندگی اور مادی زندگی میں توازن پیدا کرنے کی صلاحیت بھی نہ رکھتا ہو وہ ان کے نزدیک سامراجی فکر کا معاون ہے۔

حوالہ جات

۱۔ الازہری، عبدالصمد صارم، سوانح شاہ ولی اللہ، لاہور، ایم ثناء اللہ خان اینڈ سنز پبلشرز، ۱۹۶۷ء، ص ۳

۲۔ رحمٰن علی، مولوی، تذکرہ علمائے ہند، کراچی، پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی، ۱۹۶۱ء، ص ۵۴۴

۳۔ ان کا نکاح مولوی نوراللہ بڈھانوی کی دختر سے ہوا تھا لیکن کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ۱۷۹۴ء میں انتقال ہوا اور بڈھانہ (ضلع مظفرنگر) دفن ہیں۔

۴۔ ان کی شادی شیخ محمد عاشق پھلتی کے صاحبزادے محمد فائق سے ہوئی تھی۔ ملاحظہ ہو تذکرۃ الرشید (حاشیہ)، لاہور، مکتبہ مدنیہ، ۱۴۰۶ھ، ص ۳۰

۵۔ قاسم محمود، سید، اسلام کی احیائی تحریکیں اور عالم اسلام، لاہور، الفیصل ناشران وتاجران کتب، ۲۰۱۲ء، ص ۱۷

۶۔ پھلتی، محمد عاشق، القول الجلی، لکھنؤ، کتب خانہ انوریہ، ۱۹۹۰ء، ص ۱۲۱

۷۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ عام طور پر اپنے مکاشفات میں تاریخ نہیں لکھتے۔ لیکن اس مکاشفہ میں انہوں نے خلاف معمول تاریخ درج کی ہے، جس کے مطابق یہ مکاشفہ ۲۱ ذی قعدہ، ۱۱۴۴ھ میں پیش آیا۔ ملاحظہ ہو فیوض الحرمین، ص ۹۰۔۸۹، ادارہ اسلامیات، کراچی، مولانا مناظر احسن گیلانی نے ''تذکرہ شاہ ولی اللہ'' میں اس مکاشفہ کی اہمیت اور برعظیم کے آئندہ حالات میں اس کے کردار پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

۸۔ فریدی، نسیم احمد، مولانا، نادر مکتوبات شاہ ولی اللہ دہلوی، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۲۰۱۰ء، ص ۶۶۔۵۹

۹۔ محمد مظہر بقا، ڈاکٹر، اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ، کراچی، بقا پبلی کیشنز، ۱۹۸۶ء، ص ۱۴۳

۱۰۔ دہلوی، رحیم بخش، حیات ولی، لاہور، المکتبۃ السلفیہ، ۱۹۵۵ء، ص ۵۸۰

۱۱۔ آزاد، عبدالخالق، مفتی، ولی اللّٰہی نظامِ فکر (پس منظر اور اجمالی تعارف)، ملتان، شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن، ۲۰۰۵ء، ص ۱۰

۱۲۔ قاضی جاوید، افکار شاہ ولی اللہ، لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۶ء، ص ۴۷

۱۳۔ محمد مظہر بقاء، ڈاکٹر، اصولِ فقہ اور شاہ ولی اللہ، ص ۶۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۶۴

۱۵۔ محمد دین، شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے اقتصادی نظریات (مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی)، یونیورسٹی آف پشاور، ۱۹۸۶ء، ص ۶۲

۱۶۔ قاضی جاوید، افکارِ شاہ ولی اللہ، ص ۱۰۳

۱۷۔ نظامی، خلیق احمد، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، لاہور، ادارہ اسلامیات، ۱۹۷۸ء، ص ۱۰۳

۱۸۔ مولانا سید محمد میاں اور مولانا غلام رسول مہر نے اس نقطہ نظر کی سختی سے تردید کی ہے کہ یہ تحریک محض سکھوں کے خلاف تھی۔ اس حوالے سے ان فاضلین نے بہت عمدہ دلائل بھی پیش کیے ہیں۔ تفصیل ملاحظہ ہو علماءِ ہند کا شاندار ماضی، کراچی، مکتبہ رشیدیہ، ۱۹۹۱ء، ج ۲، ص ۲۳۔ سیرت سید احمد شہید، لاہور، کتاب

منزل، ۱۹۵۶ء ج ۱، ص ۲۳

۱۹۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جاٹ، مرہٹے اور سکھوں کے استیصال کی بات کرتے ہیں تو اس سے مقصود ان کا مغلیہ سلطنت کو بچانا ہرگز نہیں تھا بلکہ وہ سامراجی قوتیں جو خطے کو عدمِ استحکام کا شکار کر کے اس زوال میں تیزی لا رہی تھیں ان کو کم کرنا تھا تا کہ مستقبل کے لیے ایک صالح سیاسی نظامِ فکر کی تشکیل کو ممکن بنایا جا سکے۔

۲۰۔ سندھی، عبید اللہ، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک (مقدمہ)، لاہور، سندھ ساگر اکادمی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۹۔۲۰

۲۱۔ قاسم محمود، سید، اسلام کی احیائی تحریکیں اور عالمِ اسلام، ص ۹۱

۲۲۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، التفہیمات الالٰہیہ، حیدر آباد، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، ۱۹۹۷ء، ج ۱، ص ۲۸۴

۲۳۔ آزاد، عبدالخالق، ''شاہ ولی اللہ کی نظر میں سرمایہ'' مجلّہ عزم، ملتان، (سیریز نمبر: ۲۱۶)، ص ۲۵

۲۴۔ ظاہری اور باطنی خلفاء میں یہ فرق ہوتا ہے کہ اگر باطنی خلفاء ایک سے زیادہ بھی ہوں تو ان میں جنگ وجدال راہ نہیں پاتے۔ لیکن ظاہری خلفاء کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل ملاحظہ ہو فیوض الحرمین (مشاہدہ نمبر: ۳۶)، ص ۲۳۹

۲۵۔ جلبانی، غلام حسین، پروفیسر، شاہ ولی اللہ کی تعلیم، لاہور، دارالکتاب، ۲۰۰۲ء، ص ۲۲۸

۲۶۔ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انسانی سماج کی تشکیل کو چار مراحل میں تقسیم کیا ہے، جسے وہ ارتفاقات اربعہ کا نام دیتے ہیں۔ ان ارتفاقات کی بحث میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انتہائی عمدہ نکات پیش کیے ہیں۔ اس کی تفصیل حجۃ اللہ البالغہ (جلد اول) اور البدور البازغہ وغیرہ میں ملاحظہ ہو۔

۲۷۔ نظامی، خلیق احمد، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۹۳

۲۸۔ جلبانی، غلام حسین، شاہ ولی اللہ کی تعلیم، ص ۲۲۶

۲۹۔ آزاد، عبدالخالق، ولی اللّٰہی نظامِ فکر، ص ۳۶

۳۰۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، التفہیمات الالٰہیہ، ج ۱، ص ۲۸۴

۳۱۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، البدور البازغہ، حیدر آباد، شاہ ولی اللہ اکیڈمی، ۱۹۷۰ء، ص ۹۱

32. Aziz Ahmad, Studies in Muslim Culture in the Indian environment,(Oxford University Press,Pakistan,1970),207

۳۳۔ قاضی جاوید، افکار شاہ ولی اللہ، ص ۱۵۰

۳۴۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، التفہیمات الالٰہیہ، ج ۱، ص ۲۸۵

۳۵۔ نظامی، خلیق احمد، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۸۱

۳۶۔ سندھی، عبید اللہ، اردو شرح حجۃ اللہ البالغہ، کراچی، حکمت قرآن انسٹیٹیوٹ، ۲۰۱۰ء، ص ۲۹۰

۳۷۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، کراچی، قدیمی کتب خانہ، س۔ن، ج ۱، ص ۱۰۶

۳۸۔ سندھی، عبید اللہ اردو شرح حجۃ اللہ البالغہ، ص ۳۱۳

۳۹۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، ص ۲۷۶

۴۰۔ شاہ اسمٰعیل شہید، منصب امامت، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۸۸ء، ص ۱۸۸
۴۱۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، لاہور، سہیل اکیڈمی، ۱۹۷۶ء، ج ۲، ص ۱۶۱
۴۲۔ نظامی، خلیق احمد، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۸۰
۴۳۔ اگر دیکھا جائے تو ٹھیکہ داری بھی مروّجہ ظالمانہ نجکاری ہی کی ایک شکل ہے۔ استعماری قوتیں جس خطے کو کمزور کرنا چاہتی ہیں وہاں ایسے عمل کی سرپرستی کرتی ہیں تاکہ ریاست معاشی حوالے سے خودکفیل نہ ہو سکے اور ہمیشہ ان کی محتاج رہے۔ آج بیشتر عرب ممالک اور خود ہمارا خطہ بھی اس مسئلہ کا شکار ہے۔ چنانچہ ولی اللّٰہی فکر اس مسئلہ کو حل کرنے کے حوالے سے ہماری مکمل رہنمائی کرتی ہے۔
۴۴۔ نظامی، خلیق احمد، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۸۱
۴۵۔ ایضاً، ص ۶۳
۴۶۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، ص ۲۷۵
۴۷۔ قاسمی، عطاء الرحمٰن (مرتب)، امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار ونظریات (مجموعہ مقالات)، لاہور، مکتبۃ الخلیل، ۲۰۰۵ء، ص ۲۲۱
۴۸۔ سندھی، عبیداللہ، اردو شرح حجۃ اللہ البالغہ، ص ۲۷۵
۴۹۔ برکاتی، محمود احمد، حکیم، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، ص ۲۰۵
۵۰۔ سندھی، عبیداللہ، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۲۸
۵۱۔ قاسمی، عطاء الرحمٰن (مرتب)، امام شاہ ولی اللہ اور ان کے افکار ونظریات، ص ۲۲۴
۵۲۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، ص ۲۷۶
۵۳۔ برکاتی، محمود احمد، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، ص ۲۰۴
۵۴۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، ج ۱، ص ۱۳۸
۵۵۔ ایضاً، ج ۲، ص ۱۱۵
۵۶۔ قریشی، حسین محمد، ڈاکٹر، شاہ ولی اللہ کا نظریہ معیشت اور عصرِ حاضر میں اس کی افادیت، لاہور، طیب پبلشرز، ۲۰۰۲ء، ص ۱۴۴
۵۷۔ سیوہاروی، حفظ الرحمٰن، مولانا، اسلام کا اقتصادی نظام، کراچی، شیخ الہند اکیڈمی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۶۷
۵۸۔ قاسمی، غلام مصطفیٰ، سماجی انصاف اور اجتماعیت، لاہور، رحیمیہ مطبوعات، ۲۰۱۱ء، ص ۶۱
۵۹۔ سیوہاروی، حفظ الرحمٰن، اسلام کا اقتصادی نظام، ص ۶۹۲
۶۰۔ کارل مارکس کا اشتراکی مینوفیسٹو ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا تھا اور اس کا پہلا انٹرنیشنل سطح پر تعارف ۱۸۶۴ء کو پیش کیا گیا۔ اس اعتبار سے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال کارل مارکس سے کم وبیش ایک سو سال پہلے ہو چکا تھا۔
۶۱۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، البدور البازغہ، ص ۵۰
۶۲۔ بشیر احمد، شیخ، شاہ ولی اللہ کا فلسفہ عمرانیات ومعاشیات، لاہور، مکی دارالکتب، ۱۹۹۴ء، ص ۱۶۴
۶۳۔ ندوی، ابوالحسن علی، تاریخ دعوت وعزیمت، کراچی، مجلس نشریات اسلام، س۔ن، ج ۵، ص ۲۲۶

۶۴۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، ج ۲، ص ۲۷۶

۶۵۔ سندھی، عبید اللہ، مولانا، شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، لاہور، سندھ ساگر اکادمی، ۲۰۰۲ء، ص ۲۰۸

۶۶۔ قریشی، حسین محمد، ڈاکٹر، حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی کے فقہی افکار کا تحقیقی جائزہ، لاہور، جمعیۃ پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۴

۶۷۔ تصدق حسین، ڈاکٹر، ''شاہ ولی اللہ کے فلسفہ پر ایک طائرانہ نظر''، ماہنامہ الولی، حیدرآباد ج ۲، شمارہ ۲، ص ۱۷

۶۸۔ ڈاکٹر ہالے پوتہ کا ماننا ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بہت سی تحریریں فکر کی بجائے وجدان کا نتیجہ ہیں جو ذہنِ جدید کے طرزِ فکر سے بالکل متضاد ہے۔ ملاحظہ ہو (ماہنامہ الرحیم، جون ۱۹۶۶ء)، تاہم حضرت سندھی کا ماننا ہے کہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ طرزِ تحریر اپنی فکر کو نااہل لوگوں سے بچانے کے لیے اختیار کیا۔ ملاحظہ ہو (شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۳۸)

۶۹۔ فریدی، نسیم احمد، نادر مکتوبات شاہ ولی اللہ دہلوی، ص ۳۴۷

۷۰۔ دہلوی، رحیم بخش، حیاتِ ولی، ص ۵۹۲

۷۱۔ محمد سعید، خواجہ، ''عصرِ حاضر میں شاہ ولی اللہ کے فلسفہ تعلیم کی اہمیت''، سہ ماہی اسلام اور عصر جدید، دہلی، ج ۴۲، شمارہ ۴۔۳، ص ۸۹

۷۲۔ رضوی، ابوالنظر، ''شاہ ولی اللہ اور ان کی بعض علمی خصوصیات''، ماہنامہ الفرقان، بریلی، ج ۷، شمارہ ۱۲۔۹، ص، ۳۵۸

۷۳۔ برکاتی، محمود احمد، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، ص ۲۰۵

۷۴۔ محمد سعید، خواجہ، ''عصرِ حاضر میں شاہ ولی اللہ کے فلسفہ تعلیم کی اہمیت''، ص ۹۹

۷۵۔ دہلوی، شاہ عبدالعزیز، ملفوظات عزیزیہ، میرٹھ، مطبع مجتبائی، ۱۳۱۴ھ، ص ۲۷

۷۶۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، رسالہ دانشمندی، دہلی، مطبع احمدی، س۔ن، ص ۱۹

۷۷۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، التفہیمات الالٰہیہ، ج ۱، ص ۲۸۴

۷۸۔ محمد سعید، خواجہ، ''عصرِ حاضر میں شاہ ولی اللہ کے فلسفہ تعلیم کی اہمیت''، ص ۹۶

۷۹۔ برکاتی، محمود احمد، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، ص ۸۳

۸۰۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، اسلامی اصول تعلیم (مرتب: مفتی رشید احمد علوی)، لاہور، جمعیۃ پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص ۳۰

۸۱۔ قدوسی، اعجاز الحق، تذکرہ صوفیاءِ سرحد، کراچی، مرکزی اردو بورڈ، ۱۹۶۶ء، ص ۳۶۴

۸۲۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، لاہور، شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، س۔ن، ص ۴۴۔۴۰

۸۳۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، التفہیمات الالٰہیہ، ج ۱، ص ۲۸۲

۸۴۔ دہلوی، رحیم بخش، حیاتِ ولی، ص ۸۹

۸۵۔ دہلوی، شاہ ولی اللہ، التفہیمات الالٰہیہ، ج ۲، ص ۲۰۲